# مطالعۂ خطوط

## علامہ اقبالؒ خطوط کے آئینے میں

ڈاکٹر جمیل جالبی

گانٹھ وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو

یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

سب سے پہلے تو میں پنجاب یونیورسٹی کے فاضل وائس چانسلر ڈاکٹر رفیق احمد صاحب کا شکریہ ادا کرتا جنہوں نے اقبال پر لیکچر کے لیے مدعو کر کے میری عزت افزائی فرمائی۔ ساتھ ساتھ شعبۂ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر عبدالخالق کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے بار بار ٹیلیفون کر کے مجھے یاد دلانے کی زحمت اٹھائی۔ بار بار یاد دلانے کی شاید وجہ یہ تھی کہ ہمارے ملک کی جامعات کے وائس چانسلرز انتظامی امور اور بے شمار غیر علمی مسائل میں ایسے گھرے رہتے ہیں کہ علم و ادب سے ان کا رشتہ ہر روز طلوعِ آفتاب کے ساتھ کمزور سے کمزور تر ہوتا جاتا ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو شاید میں ہفتے عشرے میں یہ لیکچر تیار کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیتا پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ علامہ اقبال کے خطبات پر ایک لیکچر دوں اور بات کو وہاں تک پہنچا کر جہاں حضرت اقبال نے اسے چھوڑا تھا آگے بڑھاؤں تاکہ فکرِ اقبال کا عمل ارتقاء جاری رہ سکے۔ خیال قدم قدم آگے بڑھتا ہے اور اس وقت بڑھتا ہے جب اس پر غور کیا جائے، اس پر تبادلۂ خیال کیا جائے اور صاحبانِ فکر اسے ہر دم تنقید کی کسوٹی پر کستے رہیں۔ لیکن فکر و خیال کے تعلق سے علامہ اقبال پر لیکچر دینے کے لیے چند ماہ کی ایسی فرصت درکار تھی جس میں اس کام کے علاوہ کوئی اور معاملہ یا مسئلہ ذہن میں نہ ہو اور چونکہ ایسا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے ایک ایسا موضوع پسند کیا جس میں نہتا اتنی فرصت کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اسی لیے میں نے طے کیا کہ اقبال کے خطوط کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کی دو وجہیں اور تھیں۔ ایک یہ کہ اقبال کے خطوط پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ان کے تمام خطوط کو سامنے نہیں رکھا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اقبال کے خطوط سے ان کی ذات و شخصیت، ان کے ذہنی عوامل و رجحانات، ان کے اندازِ فکر اور حالات کی ایک ایسی بھرپور تصویر سامنے آتی ہے کہ ہمیں اقبال کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے اور ہم اقبال کو اپنی قومی اور فکری زندگی میں حقیقی اہمیت دینے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ آج ہم جہاں ہیں، آج ہم جو ہیں اور آج زندگی کی جن برکتوں سے ہم بہرہ مند ہو رہے ہیں ان میں فکرِ اقبال کی قدر ت ہے۔ اقبال کی شاعری کا مطالعہ کافی ہو چکا، اب ہمیں فکرِ اقبال کے مطالعے اور اس کی

روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اقبال کے لیے شاعری کا مقصد، جیسا کہ انہوں نے اپنے خطوط میں بار بار ذکر کیا ہے یہ ہے کہ "چند مطالب جو میرے ذہن میں ہیں ان کو مسلمانوں تک پہنچا دوں اور بس"[۱] ایک اور جگہ اسی بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ "میرے مقصد شاعرانہ نہیں بلکہ مذہبی اور اخلاقی ہیں"[۲] کیپٹن منظور حسین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میرا مقصود شاعری سے شاعری نہیں بلکہ یہ کہ اوروں کے دلوں میں بھی وہی خیالات موج زن ہو جائیں جو میرے دل میں ہیں اور بس"[۳] مولانا سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں ۱۰ اگست ۱۹۳۵ کو لکھتے ہیں کہ "فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے"[۴]

خطوط اقبال کے ان حوالوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال کی شاعری کا مقصد وہ نہیں تھا جو عام طور پر شاعری کا ہوتا ہے بلکہ وہ شاعری کے وسیلے سے امت مسلمہ کو بیدار کرنے اور اسے موجودہ صورت حال کے گرداب سے باہر نکالنے کا کام لینا چاہتے تھے تاکہ اسلام کے تعلق سے فکر و خیال کی تشکیل جدید کر کے اسلام کو پھر سے وہ قوت بنا سکیں کہ وہ اس مضطرب و بے چین دنیا کو ایک اعتدال پسند تہذیب سے روشناس کر سکے۔ ایسی انسانی تہذیب سے جہاں انسان انسان کے جبر سے آزاد ہو اور جہاں مساوات کا وہ حقیقی تصور عمل رائج ہو جس سے جسم و روح دونوں سکون و آسودگی محسوس کر سکیں یہی کام انہوں نے اپنی شاعری سے لیا اور اس بات کا اظہار انہوں نے بار بار اپنے خطوط میں کیا۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ ہمیں اس تصور کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ کر اس پر مستقل مزاجی کے ساتھ چلنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اقبال کا اتنا بڑا عطیہ ہے اور ہمارے لیے فکر و عمل کا اتنا عظیم ورثہ ہے کہ ہمیں اس کام کو مسلسل آگے بڑھانے کی ضرورت ہے کہ اس میں ہمارے شاندار مستقبل کا راز پوشیدہ ہے۔ خود اقبال اسی لیے پُر امید تھے اور پروفیسر محمد منیر اکبر کے نام ایک خط میں، جو پیام مشرق کی اشاعت کے کچھ عرصے بعد فروری ۱۹۲۴ء میں لکھا گیا تھا اقبال نے لکھا کہ "اسلام کی عظمت کا زمانہ انشاء اللہ قریب آ رہا ہے"[۵]

اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کو ان کی موجودہ پستی و زوال سے نکال اقبال کی فکر اور ان کی شاعری کا منتہائے مقصود تھا اور اسی لیے وہ ہر اس فکر و فلسفہ، ہر اس نظریے کے مخالف تھے جو مسلمانوں کو اس راستے سے دور کرتا یا ہٹاتا تھا۔ کسی نے اقبال سے بالشویک خیالات منسوب کیے تو وہ مضطرب ہو گئے اور فوراً ایڈیٹر زمیندار کے نام ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کو ایک خط میں لکھا:

> "چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہتر علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات

سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارتاً ذکر کیا ہے۔ شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔[۵]

اسی خط میں لکھتے ہیں کہ :

"اسلام سرمائے کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ "**فاصبحتم بنعمته اخوانا**" میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنی میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمائے کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔"[۶]

اور مشورہ دیا کہ :

"ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔"[۷]

علامہ اقبال کے خط کے اس طویل اقتباس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بالشویک نظام کو اس لیے ناپسند کرتے تھے کہ یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کی انتہا پسندی کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا تھا اور خود ایک نئے قسم کی

انتہا پسندی کا شکار ہو گیا تھا۔ دوسرے انہیں اس بات کا یقین تھا کہ جب اشتراکی ممالک اور خصوصاً روس اس انتہا پسندی کا ادراک کریں گے تو اسی راستے پر واپس آئیں گے جو اعتدال کا راستہ ہے اور جسے عالم انسانیت کے سامنے اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس میں سرمائے کی قوت اپنے مناسب حدود میں رہتی ہے اور مساوات کی وہ فطری معاشرتی صورت بھی سامنے آتی ہے جو جبر و استحصال سے فی الحقیقت پاک ہوتی ہے۔ اسی لیے اقبال نوجوان نسل کو مغرب کے ذہنی غلبے سے آزاد کرانا چاہتے ہیں تاکہ وہ مغرب کے سیاسی افکار اور معاشی نظام کے اثرات سے بچ کر قرآن کے نظام معیشت پر غور کرے۔ یہی وہ راستہ ہے جسے وہ تفکر اور اجتہاد کا راستہ کہتے ہیں اور جس پر انھوں نے نہ صرف اپنی تحریروں اور خطبات میں بار بار زور دیا ہے بلکہ اپنے خطوط میں متعدد جگہ اشارے بھی کیے ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کے ایمان و ایقان کی پختگی سامنے آتی ہے۔ انھوں نے کسی نجی خط میں بھی کسی بے یقینی کا اظہار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری اور اقبال کی تحریریں اپنے اندر ایمان کی پختگی اور اخلاص کی وجہ سے ہمیشہ کی طرح آج بھی انتہائی پُر اثر ہیں۔ یہی وہ طرز فکر ہے جو بند راستوں کو کھول دیتا ہے اور پہاڑوں کے سینے چیر کر ان میں فکر و عمل کی کشادہ شاہراہیں وجود میں لاتا ہے۔ مغرب نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے لیکن ساتھ ساتھ ہمیں خود سے دور کر کے ایک ایسے راستے پر ڈال دیا ہے جو تقلید و پیروی کا راستہ ہے اور جو یقیناً زندگی کو اپنی روایت، عقیدے اور ایمان کی روشنی میں اجتہاد کے عمل سے بنانے نکھارنے اور عظمت دینے کا راستہ ہرگز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے نوجوان ایک ایسے احساس کمتری میں مبتلا ہیں کہ جس نے ان کی تخلیقی قوتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اقبال ہمیں اسی احساس کمتری سے باہر نکال کر ایک نیا اعتماد پیدا کرنا چاہتے ہیں خطوط اقبال کا مطالعہ اس اعتماد کو بحال کرنے کا ایک اہم مآخذ ہے۔

اقبال کے نزدیک اسلام "نوع انسان کی اقوام کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل و قومیت کی مصنوعی مگر ارتقائے انسانی کے ابتدائی مراحل میں مفید امتیازات کو مٹانے کا عملی ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اور مذاہب (یعنی مسیحیت، بدھ ازم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا ہے؎ اور ۱۹۳۳ء کے اسی خط میں لکھتے ہیں "چونکہ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لیے یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے اس واسطے بنی نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیش نہاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطہ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں"۔ ابتدا میں، اقبال لکھتے ہیں کہ میں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی کر دی اور اب قومیت میرے نزدیک محض ایک عارضی نظام ہے جس کو ہم ایک ناگزیر زشتی سمجھ کر گوارا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ پس اسلام ایک قدم ہے نوع انسانی کے اتحاد کی طرف۔ یہ ایک سوشل نظام ہے جو حریت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ پس جو کچھ میں اسلام کے متعلق لکھتا ہوں اس سے میری غرض محض خدمت بنی نوع ہے اور کچھ نہیں اور میرے نزدیک

عملی نقطۂ خیال سے صرف اسلام ہی Ideal Humanitarian. کو achieve. کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے۔ باقی ذرائع محض فلسفہ ہیں۔[۱۳]

یہی وجہ ہے کہ جب مولانا حسین احمد مدنی مرحوم و مغفور نے وطن کو اساس قومیت کہا تو علامہ اقبال نے ان سے اختلاف کیا۔ یہ بحث نہ صرف ۳۸-۱۹۳۷ء کے اخباروں میں مہینوں چلتی رہی بلکہ اقبال پر بعض حضرات نے رکیک حملے بھی کیے۔ اقبال، جیسا کہ ان کے خطوط سے واضح ہوتا ہے، بے وجہ بحثوں میں نہیں الجھتے تھے لیکن اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ اپنی وفات سے تقریباً دو مہینے پہلے طالوت کے نام ۱۸ فروری ۱۹۳۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"جو اقتباسات آپ نے ان کے خط سے درج کیے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب (حسین احمد مدنی صاحب) نے فرمایا کہ آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں سو اگر ان کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ البتہ اگر ان کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریے کو قبول کر لیں تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کیونکہ کسی نظریے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی ہے۔ ...... مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلا دیجیے گا کہ میں ان کے احترام میں کسی اور مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں لیکن اگر مذکورہ بالا ارشاد سے ان کا مقصد وہی ہے جو میں نے اوپر لکھا ہے تو میں ان کے مشورے کو اپنے ایمان اور دیانت کی رو سے اسلام کی روح اور اس کے اساسی اصولوں کے خلاف جانتا ہوں۔"[۱۴]

اس کا جواب مولانا حسین احمد مدنی صاحب نے دیا اور لکھا کہ "میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیے۔ خبر ہے، انشا نہیں ہے۔"[۱۵]

تصورِ وطن فکرِ اقبال میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ وطنیت کے مغربی تصور کو مسلمانوں کے لیے مضر اور روحِ اسلام کے منافی سمجھتے ہیں۔ اپنی مختلف تحریروں اور شاعری میں اقبال نے اس کا بار بار اظہار کیا ہے۔ ۲ ستمبر ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں لکھا ہے کہ "اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا تھا۔"[۱۶] ایک خط بنام خان محمد نیاز الدین خان میں لکھتے ہیں کہ "یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔"[۱۷] اسی لیے اقبال عہدِ حاضر کی روشنی میں قرآن کریم کی تفسیر لکھنا چاہتے تھے جس کا ذکر انہوں نے بہت سے خطوط میں کیا ہے۔ سر راس مسعود کے نام ایک خط مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں کہ "اس طرح میرے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآن کریم پر عہدِ حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا

جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانان عالم کو نہیں کر سکتا[illegible] اسی لیے علامہ اقبال بار بار اجتہاد اور تشکیل جدید کی بات کرتے ہیں سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ایک خط مورخہ ۵ جنوری ۱۹۳۴ء میں لکھتے ہیں کہ:

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے...... جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالت نزع میں ہے غرض کہ نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں، اقبال سوال اٹھاتے ہیں، آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے؟ اس مبحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمایئے۔"[illegible]

وہ مسئلہ جو اس وقت اقبال کے سامنے تھا وہی مسئلہ آج بھی دنیا ئے اسلام کے سامنے ہے کہ کس طرح قرآن کی روشنی میں ایسا نظامِ حیات بروئے عمل لایا جائے جو ساری دنیا کے لیے اعتدال اور خیر و نیکی کا سبب ہو، تاکہ عدل و مساوات پر مبنی ایک زندہ و متحرک معاشرہ پیدا کیا جا سکے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور صرف ایک فرد کا کام نہیں ہے بلکہ اس کام کے لیے ہمیں مسلسل اجتماعی سطح پر زندگی کے ہر شعبے میں غور و فکر، تحقیق اور اجتہاد کی ضرورت ہے تاکہ وہ دین جسے دین کامل کہا گیا ہے اور جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آیا ہے اپنی حقیقی روح کے ساتھ نظامِ عالم کو بدل کر تہذیب و تمدن کے لیے ایک نئے دور کا آغاز کر سکے یہی ہم پاکستانیوں کی منزل ہونی چاہیے۔

اسلام کی اسی حقیقی روح کی تلاش میں اقبال نے ہر اس تصور کو رد کیا جو ان کے فکری راستے میں رکاوٹ بن کر سامنے آیا یہی وجہ ہے کہ تصوف کو انہوں نے اس طرح قبول نہیں کیا جس طرح وہ صوفیوں کی خانقاہوں یا عملی زندگی میں نظر آتا تھا حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے نام ایک خط مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء میں اقبال لکھتے ہیں کہ:

"تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے...... منصور حلاج کا رسالہ "کتاب الطواسین" جس کا ذکر ابن حزم کی فہرست میں ہے، فرانس میں شائع ہو گیا ہے۔ مولف نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں.... ...حسین کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کی سزا دہی میں بالکل حق بجانب تھے۔"[illegible]

اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد تصوف کی یہ بحث اتنی بڑھی کہ اس دور کے اخبارات و رسائل

میں طرح طرح کے مضامین شائع ہوئے ۔ اس مخالفت میں خواجہ حسن نظامی بھی شامل تھے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک خط میں انہیں لکھا کہ "حقیقی اسلامی تصوف کا میں کیوں کر مخالف ہو سکتا ہوں کہ خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ بعض لوگوں نے غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کر دیے ہیں..... انہیں غیر اسلامی عناصر کی وجہ سے ہی مغربی محققین نے تمام تصوف کو غیر اسلامی قرار دیا ہے۔"[۱۸] خواجہ حسن نظامی کے نام ایک اور خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ "مسئلہ وحدت الوجود ان معنوں میں کہ ذات باری تعالیٰ ہر شے کی عین ہے قرآن سے ثابت نہیں اور روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریق "صحو" ہے نہ کہ "سکر"۔"[۱۹]

خان نیاز الدین خان مرحوم کے نام جو خط اقبال نے لکھے ان میں کئی خطوط میں جا بجا تصوف کے تعلق سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ اقبال جس فکر کے حامل تھے اس میں خالص اسلامی تصورات ہی عہدِ جدید کی زندگی کے مسائل کا حل پیش کر سکتے تھے۔ چودہ صدیوں کے سفر میں اور خصوصاً عجمی اثرات، اسلام کو خالص قرآنی اثرات سے ہٹا کر، اس طور پر صورت پذیر ہوئے کہ وہی اصل الاصول نظر آنے لگے۔ اس بحث میں، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، جو اسرار خودی کی اشاعت کے بعد شروع ہوئی اور ۱۹۱۵-۱۹۱۶ء کے بعد تک جاری رہی اقبال نے وضاحت کے لیے خود بھی کئی مضامین لکھے جو "وکیل" امرتسر میں شائع ہوئے۔ اسی بحث کی جھلک اور اقبال کا زاویۂ نگاہ ان کے خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ اقبال کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ "رہبانیت عیسائی مذہب کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر قوم میں پیدا ہوئی ہے اور ہر جگہ اس نے شریعت اور قانون کا مقابلہ کیا ہے اور اس کے اثر کو کم کرنا چاہا ہے۔ اسلام حقیقت میں اسی کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا (اور تصوف سے میری مراد ایرانی تصوف ہے) اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہبی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ قرمطی تحریک سے بھی تصوف نے فائدہ اٹھایا ہے محض اسی وجہ سے کہ قرمطی تحریک کا مقصد بالآخر قیودِ شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا۔"[۲۰] اور اسی وجہ سے اقبال شیخ محی الدین ابن عربی کے ان عقائد کو، جن کا اظہار انہوں نے قرآنی آیات سے استنباط کر کے، مسئلہ قدم ارواح اور مسئلہ وحدت الوجود کی صورت میں کیا ہے قبول نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ "میں ان کو (ابن عربی) ایک مخلص مسلمان سمجھتا ہوں مگر ان کے عقائد کا پیرو نہیں ہوں۔"[۲۱]

اقبال اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ صوفیا کرام کو "توحید" اور "وحدت الوجود" کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی۔ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں بلکہ متقدم الذکر کا مفہوم خالص مذہبی ہے اور موخر الذکر کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کے مقابلے میں یا اس کی ضد لفظ کثرت نہیں، جیسا کہ صوفیا نے تصور کیا ہے، بلکہ اس کی ضد شرک ہے۔ وحدت الوجود کی ضد کثرت ہے..... اسلام کی تعلیم نہایت صاف و روشن ہے یعنی یہ کہ عبادت کے قابل صرف ایک ذات ہے۔ باقی جو کچھ کثرت نظامِ عالم میں نظر آتی ہے وہ سب کی سب مخلوق ہے..... چونکہ صوفیا نے فلسفے اور مذہب کے دو

مختلف مسائل یعنی توحید اور وحدت الوجود کو ایک ہی مسئلہ سمجھ لیا اس واسطے ان کو یہ فکر ہوئی کہ توحید ثابت کرنے کا کوئی طریق ہونا چاہیے جو عقل و ادراک کے قوانین سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس غرض کے لیے حالت سکر ممد و معاون ہوئی اور یہ اصل ہے مسئلہ حال و مقامات کی...... قرآن کی تعلیم کی رو سے وجود فی الخارج کو ذات باری سے نسبت اتحاد کی نہیں بلکہ مخلوقیت کی ہے[۲۳] واضح رہے کہ یہ لکھ کر وہ سارے تصوف کو رد نہیں کرتے بلکہ اسکے اس حصے کو رد کرتے ہیں جو قرآن سے نہ صرف ثابت نہیں ہے بلکہ قرآن کے منافی بھی ہے لیکن اس حصے کو جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے وہ پسندیدہ نظر سے دیکھتے ہیں[۲۴] لیکن ساتھ ساتھ جب حضرات صوفیہ شریعت کو ظاہر اور تصوف کو باطن کہتے ہیں تو اقبال یہاں ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ "اس پر آشوب زمانے میں وہ ظاہر جس کا باطن تصوف ہے، معرض خطر میں ہے۔ اگر ظاہر قائم نہ رہا تو اس کا باطن کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ مسلمانوں کی حالت آج بالکل ویسی ہے جیسے کہ اسلامی فتوحات ہندوستان کے وقت ہندوؤں کی تھی یا ان فتوحات کے اثر سے ہو گئی۔ ہندو قوم کو اس انقلاب کے زمانے میں منو کی شریعت کی کورانہ تقلید نے موت سے بچا لیا۔ اپنی شریعت کی حفاظت کی وجہ سے ہی یہودی قوم اس وقت تک زندہ ہے ورنہ اگر فیلو (پہلا یہودی متصوف) قوم کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا تو آج یہ قوم دیگر اقوام میں جذب ہو کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو چکی ہوتی۔"[۲۵]

یہی وجہ ہے کہ تصوف کے تعلق سے وہ حافظ شیراز کو رد کرتے ہیں جس کا اظہار انھوں نے مثنوی اسرار خودی میں کیا تھا لیکن بحیثیت شاعر وہ ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور ان دونوں پہلوؤں کو الگ الگ رکھتے ہیں "شاعرانہ اعتبار سے میں حافظ کو نہایت بلند پایہ سمجھتا ہوں۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے یعنی جو مقصد اور شعراء پوری غزل میں بھی حاصل نہیں کر سکتے خواجہ حافظ اسے ایک لفظ میں حاصل کر لیتے ہیں۔"[۲۶]

صبا بہ مولدِ حافظ سلام ما برسان
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

میں نے اب تک اقبال کے بنیادی حوالے یعنی احیاء اسلام کے مختلف پہلو اقبال کے خطوط سے اس طور پر پیش کیے ہیں کہ ایک مربوط واضح تصویر آپ کے سامنے آ جائے۔ یہ تصویر کا رخ ہے لیکن خطوط اقبال پر ابھی پوری طرح توجہ نہیں ہوئی اور ان پر وہ کام نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ ان خطوط سے جہاں اقبال کی شخصیت کے بہت سے بے نام پہلو سامنے آتے ہیں وہاں ان کے مزاج کی شیریں سخنی، رواداری، رکھ رکھاؤ اور خلوص وغیرہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط میں اقبال کے نقادوں، اقبال کے سوانح نگاروں، اقبال محققوں کے لیے بہت کچھ مسالہ موجود ہے جس سے استفادہ کر کے وہ اقبال کے مطالعے کو مزید آگے بڑھا سکتے ہیں۔ ان خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں اقبال اپنے خیالات کی خود وضاحت کرتے ہیں۔ صاف و سادہ زبان میں اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے ایک ایسا مرد مومن سامنے آتا ہے جو علم و فضل کا پیکر بھی ہے اور دل درد مند بھی رکھتا ہے۔ مطالعہ خطوط کے بعد اقبال ہمیں اور زیادہ محبوب ہو جاتا ہے۔ خطوط کے مطالعہ سے اس

بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ اقبال کی فکر اور ان کا ذہن آئینہ کی طرح صاف ہے اور ان کے ایمان میں پہاڑ کا سا استحکام ہے۔ وہ دوستوں کی محفلوں میں خوش گفتار ہیں اور اپنے مزاج کی شگفتگی سے محفلوں کی رونق و بہار ہیں۔ مولانا گرامی کے نام ان کے خطوط اس سلسلے میں خاص طور پر دلچسپ ہیں۔

مولانا گرامی کو ۲۷ اگست ۲۳ء کے خط میں لکھتے ہیں "ذیابیطس کا ایک مجرب نسخہ میں نے خان بہادر اللہ بخش خان مرحوم سے سنا تھا۔ جامن کی گٹھلی سائے میں خشک کیجیے، پھر اسے پیس کر کپڑے میں چھان کر اور ذرا سا نمک ملا کر پانی کے ساتھ بقدر دو تین ماشہ صبح کھایا کیجیے۔ وہ کہتے تھے کہ بیماری کی ابتدا ہو تو اس سے صحت ہو جاتی ہے۔ سو اگر آپ کا ذیابیطس جوانی کی غلط کاریوں کا نتیجہ ہے تو شاید یہ نسخہ مفید نہ ہوگا لیکن اگر بڑھاپے کی غلط کاری کا نتیجہ ہے تو ضرور مفید ہوگا۔[۱۶] مولانا گرامی کے نام خطوط میں یہ شگفتہ بیانی روح بیان کا حصہ ہے۔ ۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ "آپ کا تخلص گرامی کی جگہ "نومی" ہونا چاہیے کیونکہ آپ سوتے بہت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ راون، لنکا کے بادشاہ کی طرح آپ چھ ماہ سوتے ہیں اور چھ ماہ جاگتے ہیں۔"[۱۷] مولانا گرامی کے نام خطوط میں علامہ اقبال کی مولانا سے نہ صرف گہری محبت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ وہ انہیں فارسی زبان کا ایک ایسا شاعر سمجھتے ہیں جو دور اکبری کی روایت فارسی کا آخری شاعر ہے۔ بار بار اپنا کلام ان کو بھیجتے ہیں اور ان سے رائے طلب کرتے ہیں۔ مولانا گرامی جواب دینے میں نہایت سست ہیں اس لیے انہیں بیدار کرنے کے لیے پے در پے خط لکھتے ہیں اور تقاضا کرتے ہیں کہ "جواب لکھیے اور جلد اشعار کے متعلق جو کچھ میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دیجیے۔"[۱۸] ایک اور خط میں لکھتے ہیں "فارسی ادب کی چند نہایت عمدہ نظم و نثر اخلاق و تاریخ وغیرہ کی کتابوں کے نام تحریر فرمائیے جو آپ کے نزدیک نہایت عمدہ ہیں۔ قدیم و حال کی تصانیف دونوں کے نام مطلوب ہیں۔"[۱۹] "تیسرے شعر میں لفظ پورش اور آخری شعر میں لفظ پیکار کھٹکتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی مزاحمت پر غالب آنے سے قوی تر ہوتی ہے۔ کوئی لفظ جو پیکار سے بہتر ہو تجویز فرمائیے۔"[۲۰] ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ "چند شعر عقل اور عشق پر ہیں جو عرض کرتا ہوں...... بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرما کر واپس کیجیے۔"[۲۱] ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "گرامی معجز نگار ہندوستان کے لیے سرمایۂ ناز ہے اور آج ایران میں بھی ایسا سحر طراز نہ ہوگا۔ زندہ باش اے پیر کہن۔"[۲۲] مولانا گرامی کے نام علامہ اقبال کے خطوط میں اکثر لاہور آنے کی فرمائش کی جاتی ہے اور مولانا ہر بار وعدہ کر کے اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ سارے خطوط میں، جو شائع ہوئے ہیں، ایک جگہ ان کے لاہور آنے کا پتا چلتا ہے۔[۲۳]

خان محمد نیاز الدین خان کے نام خطوں سے اقبال کے ایک ایسے شوق کا بھی پتہ چلتا ہے جس کا ذکر عام طور پر نہیں آتا اور وہ کبوتر رکھنے، پالنے اور اڑانے کا شوق ہے۔ اس مجموعے میں اس موضوع پر اقبال نے کم از کم ۸ خطوں میں کبوتروں پر بات کی ہے۔ ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"کبوتروں کے دو جوڑے جو آپ نے بکمال عنایت عطا فرمائے تھے ان میں سے ایک جوڑا بچے نہیں دیتا انڈے توڑ

ہے اور دوسرے کبوتروں کے نیچے بھی اس کے انڈے رکھے جائیں تو بچے نہیں نکلتے۔ دوسرے جوڑے نے بچے دیے مگر ان میں سے دو جو بہت اچھا اڑتے تھے شکاری جانوروں کا شکار ہو گئے۔ ایک باقی ہے۔ جوڑے میں ترضعیف اور کمزور ہے۔ امید نہیں دیرینک زندہ رہے..... میں نے لدھیانے بھی لکھا ہے اور شاہجہانپور سے بھی انشاء اللہ کبوتر آئیں گے۔ آپ کے صاحبزادے نے ذکر کیا تھا کہ فیروزپور میں کوئی شخص ہے جو کبوتروں کو مستقل رنگ دے سکتا ہے جو رنگ اگلے بچوں میں منتقل ہو سکتا ہے۔ مہربانی کر کے دریافت کیجیے کہ اس آدمی کا پتہ کیا ہے کل کرنل سٹیفن سن صاحب سے کبوتروں کے رنگوں کے متعلق بہت گفتگو ہوئی انہوں نے چند کتابوں کے نام لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔"[۳۴]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ:

"آپ کے کبوتر بہت اچھے ہیں۔ مگر افسوس کہ زمانہ حال کی مغربی تہذیب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سے بہت بیزار ہیں۔"[۳۵]

خطوط کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی طرح اقبال کو بھی آم بہت پسند تھے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"آموں کی کشمکش علم سے کچھ کم نہیں۔ یہ بات بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ کھانے پینے کی چیزوں میں صرف آم ہی ایک ایسی شے ہے جس سے مجھے محبت ہے۔"[۳۶]

"ہاں آموں پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ گزشتہ سال مولانا اکبر نے مجھے ٹوکرا آم بھیجا تھا۔ میں نے پارسل کی رسید اس طرح لکھی:"

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا[۳۷]

اکبر کا ذکر آیا تو بتاتا چلوں کہ علامہ اقبال کو اکبر الہ آبادی سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ انہوں نے ان کے رنگ سخن میں نہ صرف شاعری کی بلکہ وہ اکبر کو "اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر" سمجھتے تھے۔ ایک خط مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۱۸ء میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کو لکھتے ہیں کہ "مولانا اکبر الہ آبادی نے جن کا ادب و احترام میں اس طرح کرتا ہوں جس طرح کوئی مرید اپنے پیر کا احترام کرے۔"[۳۸] ایک اور خط مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو جب اقبال کو اکبر کی وفات کی اطلاع ملی تو لکھا کہ "اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نقطہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔"[۳۹] ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں اکبر کو لکھا کہ "حضرت! میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں..... عام لوگ شاعر کو نہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کو داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بالفاظ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اس خیال سے چند

اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر عوام کے رجحان و بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے۔ سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے۔" علامہ اقبال کی اکبر سے عقیدت و محبت کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ اکبر الٰہ آبادی بھی احیائے اسلام کے داعی تھے اور اپنی شاعری سے مسلمانوں کے اندر اسی طرح بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے جس طرح اقبال اپنی شاعری سے پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس صدی میں یہ کام اتنے بڑے پیمانے پر اپنے اپنے انداز سے حضرت اکبر الٰہ آبادی اور علامہ اقبال نے کیا ہے اور ان دونوں عظیم انسانوں کا شعور آج برِعظیم کے مسلمانوں کے احساس کے اندر شامل اور ان کے خون میں گردش کر رہا ہے۔ یہ دونوں شاعر اتنے عظیم ہیں کہ ہم ان پر جتنا فخر کریں کم ہے۔

ان باتوں کے علاوہ اقبال کے خطوط سے بے شمار معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بہت سے واقعات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں کی تاریخ پیدائش و وفات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بیرسٹری کا آغاز کب کیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر عربی سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے انھوں نے اکتساب فیض کیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں وہ پہلی بار دہلی گئے۔ تعلیم کو وہ عروج و کمال کا زینہ سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی قوم زندہ قوموں میں شمار نہیں ہو سکتی جس قدر قومیں آج آپ کو مہذب، شائستہ اور ترقی یافتہ نظر آتی ہیں وہ علم کے زینے ہی سے آسمانِ عروج و کمال پر پہنچی ہیں۔ اسی طرح کئی قطعات تاریخ وفات ملتے ہیں مثلاً نادر حسین کے قطعۂ تاریخ میں اس خوبصورت مصرعے سے تاریخ وفات نکالی ہے "کشت سید را زیبے کافرے" اور لکھا ہے کہ "مادۂ تاریخ الہامی ہے۔" ایک خط سے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال فرزند ارجمند علامہ اقبال کے سال پیدائش کی تصدیق ہوتی ہے۔ ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے خط میں اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو لکھا کہ "جاوید اب بالکل تندرست ہے۔ آج پورے ایک سال کا ہو گیا ہے۔ اس کی والدہ آج قربانی دینے میں مصروف ہے۔" ایک خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال نے مسجد قرطبہ میں نماز جنوری ۱۹۳۲ء میں پڑھی تھی۔ لکھتے ہیں "میں آج شام ہسپانیہ سے مع الخیر واپس آ گیا۔ ...... اور اپنی خواہش کے مطابق مسجد قرطبہ میں نماز پڑھی۔" مولانا شوکت علی نے بڑھاپے میں ایک انگریز لڑکی سے شادی کر لی تھی اس بات کا ذکر بھی ایک خط میں کیا ہے۔ جداگانہ انتخاب کو بھی ایک خط میں موضوع بنایا ہے اور لکھا ہے کہ "اگر آج مسلمانوں نے قبل از وقت جداگانہ انتخاب سے دست برداری کر لی تو آئندہ مؤرخ ان کے ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے مٹ جانے کے لیے حکومت برطانیہ کو ہرگز مطعون نہ کرے گا بلکہ خود مسلمانوں کو اس بات کا مجرم قرار دے گا کہ جمہوری نظام میں بحیثیت اقلیت انھوں نے اپنی بربادی اپنے ہاتھوں مول لے لی۔" ایک خط میں برگساں سے تقریباً دو گھنٹے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

اقبال کے نزدیک "اسلامی معاشیات کی روح یہ ہے کہ سرمائے کی بڑی مقدار میں اضافے کو ناممکن بنا دیا جائے۔" خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے دوست، ہمدرد انسان اور ایک شفیق باپ تھے، جب نواب بھوپال نے ۱۹۳۰ء میں

۵۰۰ روپے ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا، اور اس وظیفہ کا ایک سبب یہ تھا کہ اقبال جو کتاب مقدمۃ القرآن کے نام سے لکھنا چاہتے تھے، اس کے لیے انھیں مالی فراغت فراہم کی جائے تو ڈاکٹر تاثیر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اسی سال کے دوران میں امید ہے صورِ اسرافیل بھی ختم ہو جائے گی۔ پھر کچھ مدت کے لیے مقدمۃ القرآن کے لیے اپنے آپ کو وقف کردوں گا۔ باقی اب زندگی میں کوئی دلچسپی مجھ کو نہیں رہی صرف جاوید و منیرہ کی خاطر زندہ ہوں۔"[50]

ایک خط مورخہ ۸ جون ۱۹۳۲ء میں مولانا محمد عرفان خان کو بصیغہ راز لکھا کہ "ایک ہندو بزرگ مسٹر للت کا خط میرے پاس آیا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ مونجے تمہاری اسکیم کو جو تم نے لیگ کے صدارتی ایڈریس میں پیش کی تھی تسلیم کرتے ہیں۔ پنڈت مالوی سے بھی مشورہ کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ وہ بھی ہندو مسلمانوں کی صلح کی خاطر اس کو تسلیم کرلیں گے گو اس وقت علانیہ طور پر اس اسکیم کو تسلیم کرنا مصلحت نہیں ہے...... آپ سمجھ گئے ہوں گے یعنی شمالی ہندوستان کے مسلمان صوبوں کا ایک ہو جانا"[51] یہی وہ تصور ہے جو آج پاکستان کی شکل میں ہماری محبتوں کا جوہر ہے۔ ایک خط میں اپنی لدھیانے والی بیوی کی ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو وفات کی اطلاع مولانا گرامی کو ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کے خط میں دی ہے۔[52]

ان کے علاوہ خطوطِ اقبال سے ان کی بہت سی نظموں اور مجموعہ ہائے کلام کی تکمیل و اشاعت کی تاریخیں بھی سامنے آتی ہیں مثلاً ۱۳ جولائی ۱۹۱۴ء کے آس پاس اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی لکھنی شروع کی تھی[53] جو ۱۸ جنوری ۱۹۱۵ء تک ختم ہو گئی[54] یکم جولائی ۱۹۱۷ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی رموزِ بے خودی بھی قریب الختم ہے[55] ۲۲ فروری ۱۹۲۳ء کے ایک خط میں مولانا گرامی کو مطلع کرتے ہیں کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں وہ اپنی نئی نظم "طلوعِ آفتاب" جو اس وقت زیرِ تصنیف تھی پڑھ کر سنائیں گے[56] ۸ مارچ ۱۹۲۳ء کو لکھتے ہیں کہ "پیامِ مشرق" کا تب لکھ رہا ہے[57] ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کے خط میں گرامی صاحب کو لکھتے ہیں کہ میری کتاب زبورِ عجم ختم ہو گئی ہے[58] ۲۰ جنوری ۱۹۳۸ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ "آخری نظم جاوید نامہ جس کے دو ہزار اشعار ہوں گے ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ممکن ہے مارچ تک ختم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی ڈوائین کامیڈی ہے اور مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔"[59] میں نے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں ورنہ خطوطِ اقبال سے اس نوع کی معلومات فراہم کر کے ان کے ذہن کے ارتقا کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

نذیر نیازی کے نام خطوط میں علامہ اقبال نے اپنی بیوی یعنی والدۂ جاوید کی علالت کا اس کثرت سے ذکر کیا ہے کہ اگر ان تفصیلات کو سامنے رکھا جائے تو آج، جب علمِ طب بہت ترقی کر گیا ہے، علامہ اقبال اور ان کی بیگم کے مرض کی آسانی سے تشخیص کی جا سکتی ہے۔ یہ کام ملک کے کسی فاضل ڈاکٹر کو کرنا چاہیے تاکہ حیاتِ اقبال کا یہ گوشہ بھی مکمل ہو جائے۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیوی والدہ جاوید کی وفات ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو چھ بجے شام ہوئی۔[60]

غرض کہ اقبال کے خطوط علم، فکر اور معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ ہیں جن کے مطالعے سے اقبال کی زندگی کے مختلف گوشے واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ میں نے آج کے لیکچر میں اقبال کے نقطۂ نظر کو ان کے خطوط کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش

کی ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان خطوط میں اقبال کی شخصیت کی طرح ایک ایسی رنگارنگی ہے کہ ہم ان خطوط کے بغیر اقبال کی فکر، اقبال کی شاعری اور اقبال کی ملی اور قومی خدمات کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے باقی خطوط بھی جن میں مس ویگے ناست، عبدالعزیز مالواڑہ، حافظ محمود شیرانی وغیرہ کے خطوط شامل ہیں جواب تک دستیاب ہو چکے ہیں مرتب کر کے جلد شائع کیے جائیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ قومی عجائب خانہ کراچی نے وہ خطوط بھی علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد سے جولائی ۱۹۸۴ء میں حاصل کر لیے ہیں جو انہوں نے اپنے والد محترم شیخ نور محمد، اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد، اپنی ایک بہن اور ایک اور بھتیجے ممتاز احمد کے نام لکھے تھے اور جن کی تعداد علی الترتیب ۲۸، ۳۶، ۳۰، ۱، اور ۱ ہے اور جنکی کل تعداد ۹۶ ہے۔ ان کے علاوہ اپریل ۱۹۸۵ء میں بھی ۴۸ خطوط قومی عجائب خانہ کراچی نے اور حاصل کیے ہیں۔ گو یہ خطوط اقبال کے نہیں ہیں لیکن ان کے لکھنے والوں میں علامہ اقبال کی پہلی بیگم کریم بی بی ان کی بیٹی معراج بیگم، ان کے بیٹے آفتاب اقبال، مس بیک، سر ظفر اللہ خان، سید حیدر امام، شیخ عطا محمد، علامہ اقبال کے ہم زلف خواجہ فیروز الدین، شیخ عطا محمد کے بیٹے شیخ غلام محمد وغیرہ شامل ہیں اور جن کے مطالعے سے اقبال کی زندگی کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔

ان کے علاوہ اقبال کے اب تک جتنے خطوط سامنے آئے ہیں وہ سب کے سب کتابی صورت میں مرتب و شائع نہیں ہوئے ہیں۔ بہت سے خطوط گذشتہ ۵۔۶ سال کے عرصے میں اقبال نمبروں میں شائع ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو بھی کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ اقبال نے اردو انگریزی میں ہزاروں خطوط لکھے ہوں گے جن میں سے لاتعداد خطوط ضائع ہو گئے لیکن جو بچے ان سے اقبال فہمی میں یقیناً بہت مدد ملتی ہے۔ ان خطوط میں ایک خط عربی میں اور غالباً دو فارسی زبان میں بھی ہیں۔

اقبال نے سارے خطوط عام بول چال کی زبان میں لکھے ہیں اور گہرے سے گہرے مطالب کو صفائی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اختصار ان کی نثر کا حسن ہے۔ اسی صفائی، اختصار، عام بول چال کی زبان اور عام لہجے کی وجہ سے یہ نثر آج بھی تازہ ہے اور پوری طرح ابلاغ کرتی ہے۔

خطوط اقبال کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر ہر خط کا جواب دیتے تھے اور بہت جلد دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہے کہ اس عمل میں بھی وہ سنت رسولؐ کی پیروی کرتے تھے۔ حضرت امام بخاریؒ نے محدثین کے حالات میں ایک جگہ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ خط کا جواب دینا اسی طرح واجب ہے جس طرح سلام کا جواب دینا۔[۲۳]

خواتین و حضرات!

میرا خیال ہے کہ میں نے خطوط اقبال کے تعارف میں خاصا وقت لیا ہے اور اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے خطبے کو ختم کروں اور آپ کا شکریہ ادا کر کے سلام رخصت کے ساتھ اجازت چاہوں۔ ("اقبال لیکچر" — پنجاب یونیورسٹی)

# حواشی

۱۔ خط بنام محمد دین فوق، انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار اقبال اکادمی کراچی ۱۹۶۷ء ص ۶۴
۲۔ خط بنام ڈاکٹر سید یامین ہاشمی، ایضاً ص ۱۹۳
۳۔ ایضاً ص ۲۸۷
۴۔ اقبال نامہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ لاہور ۱۹۴۵ء ص ۱۹۵
۵۔ اقبال نامہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ لاہور ۱۹۵۱ء ص ۱۶۶
۶۔ گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل، ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۹ء ص ۶
۷۔ گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۹ء ص ۸،۷
۸۔ ایضاً ص ۸
۹۔ خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی مکتبہ خیابان ادب لاہور ۱۹۷۶ء خط بنام سید محمد سعید الدین حجازی ص ۱۶۵، ۱۶۶
۱۰۔ ایضاً
۱۱۔ انوار اقبال، مرتبہ بشیر احمد ڈار اقبال اکادمی کراچی ۱۹۶۷ء ص ۱۶۷، ۱۶۸
۱۲۔ ایضاً ص ۱۷۰
۱۳۔ خط بنام وحید احمد مدیر نقیب بدایوں مطبوعہ ایضاً ص ۱۷۶
۱۴۔ مکاتیب اقبال مطبوعہ بزم اقبال لاہور ۱۹۵۴ء ص ۹
۱۵۔ اقبال نامہ حصہ اول ص ۳۵۷، ۳۵۸
۱۶۔ ایضاً ص ۱۸۱
۱۷۔ ایضاً ص ۵۳، ۵۴
۱۸۔ انوار اقبال ص ۱۸۱
۱۹۔ انوار اقبال ص ۱۸۴
۲۰۔ خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۱۱۵
۲۱۔ ایضاً ص ۱۱۷

۲۲۔ خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۱۱۸
۲۳۔ مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان بزم اقبال۔ لاہور ۱۹۵۴ء ص ۲
۲۴۔ مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان لاہور ۱۹۵۴ء ص ۱۹۵
۲۵۔ اقبال نامہ دوم ص ۲۱۱
۲۶۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ محمد عبداللہ قریشی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۹۹ء ص ۲۲۸
۲۷۔ ایضاً ص ۹۶
۲۸۔ ایضاً ص ۹۱
۲۹۔ ایضاً ص ۹۷
۳۰۔ ایضاً ص ۱۱۰
۳۱۔ ایضاً ص ۱۱۴
۳۲۔ ایضاً ص ۱۰۱
۳۳۔ ایضاً ص ۱۹۰
۳۴۔ مکاتیب اقبال بنام خان نیاز الدین خان ص ۲۱-۲۲
۳۵۔ ایضاً ص ۳۹
۳۶۔ ایضاً ص ۳۳
۳۷۔ ایضاً ص ۹
۳۸۔ انوار اقبال ص ۱۸۵
۳۹۔ انوار اقبال ص ۱۹۷
۴۰۔ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۴۰، ۴۱
۴۱۔ خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۷۲
۴۲۔ ایضاً ص ۷۳
۴۳۔ ایضاً ص ۷۶
۴۴۔ ایضاً ص ۱۰۹
۴۵۔ ایضاً ص ۱۲۷
۴۶۔ ایضاً ص ۱۷۶

۴۷۔ ایضاً ص ۲۱۱
۴۸۔ ایضاً ص ۲۱۵
۴۹۔ ایضاً ص ۲۲۰
۵۰۔ ایضاً ص ۲۲۷
۵۱۔ ایضاً ص ۲۲۷
۵۲۔ انوار اقبال ص ۲۰۶
۵۳۔ انوار اقبال ص ۲۰۸، ۲۰۹
۵۴۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۲۳۷
۵۵۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۹۸
۵۶۔ ایضاً ص ۹۹
۵۷۔ ایضاً ص ۱۲۴
۵۸۔ ایضاً ص ۲۲۵
۵۹۔ ایضاً ص ۲۲۷
۶۰۔ ایضاً ص ۲۴۱
۶۱۔ اقبال نامہ اول ص ۲۱۶
۶۲۔ مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء ص ۲۷۴
۶۳۔ خطبات بہاولپور۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ خان، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ۱۴۰۱ھ ص ۱۰۶

---

# ماخذ


۱۔ شاد اقبال مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن ۱۹۴۲ء
۲۔ نوادر اقبال: صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول مرتبہ محمد عبداللہ قریشی لاہور
۳۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۴۲ - ۱۹۶۸ء

۴۔ اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۴۵ء
۵۔ اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۵۱ء
۶۔ مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان بزم اقبال لاہور ۱۹۵۴ء
۷۔ اقبال بعطیہ بیگم مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی۔ اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۵۶ء
۸۔ مکتوبات اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۵۷ء۔ ۱۹۷۷ء
۹۔ انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی پاکستان کراچی ۱۹۷۶ء
۱۰۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۶۹ء۔ ۱۹۸۱ء
۱۱۔ گفتار اقبال، محمد رفیق افضل، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۹ء
۱۲۔ اقبال اور عبدالحق مرتبہ ڈاکٹر ممتاز حسن مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۳ء
۱۳۔ اقبال اور بھوپال صہبا لکھنوی اقبال اکادمی پاکستان کراچی ۱۹۷۳ء
۱۴۔ اوراق گم گشتہ رحیم بخش شاہین اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۷۵ء
۱۵۔ خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی مکتبہ خیابان ادب لاہور ۱۹۷۶ء